میرزا ادیب

(۱۹۱۴ء۔۱۹۹۹ء)

میرزا ادیب کا اصل نام دلاور حُسین علی اور قلمی نام میرزا ادیب ہے۔ ۱۹۳۱ء میں اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ لاہور سے میٹرک کرنے کے بعد انھوں نے ۱۹۳۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے آنرز کیا۔

میرزا ادیب کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۶ء سے ہوا۔ اس زمانے میں اسلامیہ کالج لاہور میں بہت سی علمی و ادبی شخصیات موجود تھیں جنھوں نے میرزا ادیب کے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں معاونت کی۔ میرزا ادیب نے ابتدا میں شعر و شاعری کی طرف توجہ دی مگر جلد ہی اسے ترک کر کے افسانہ اور ڈراما نگاری کی طرف آ گئے۔

انھوں نے ۱۹۳۵ء میں رسالہ ''ادبِ لطیف'' کی ادارت سنبھالی اور طویل عرصے تک اس سے وابستہ رہے، پھر ریڈیو پاکستان میں ملازم ہو گئے۔

میرزا ادیب افسانہ نگاری اور یک بابی ریڈیائی ڈراما نگاری میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ تقسیمِ ہند کے بعد اُردو ادب میں یک بابی ڈرامے کو جو فروغ ملا، اس میں میرزا ادیب نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ معاشرے کے نبض شناس تھے، اس لیے ان کے ڈراموں کے موضوعات عام اور روزمرّہ زندگی سے متعلق ہیں۔ اپنے معاشرے کی انسانی خواہشات اور توقعات کو میرزا ادیب نے خاص اہمیت دی ہے۔

میرزا ادیب نے کردار نگاری کے سلسلے میں بھی گہرے مشاہدے، انمول بصیرت اور فن کارانہ مہارت سے کام لیا ہے۔

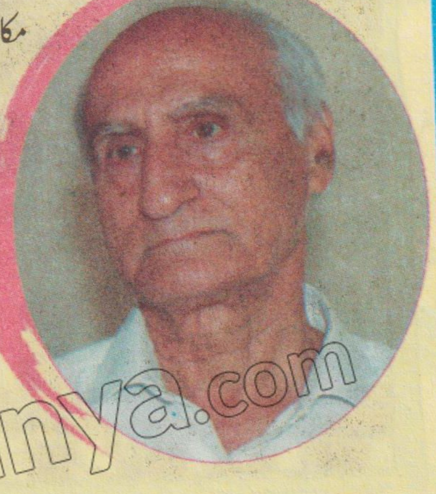

انھوں نے زندگی کے عام کرداروں کو افسانوی اور ڈرامائی کرداروں کا درجہ دیا ہے۔ ان کے مکالمے نہایت برجستہ، مختصر اور برمحل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈراموں اور افسانوں میں قاری یا ناظر کی دل چسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے جو کسی کامیاب ڈراما نگار اور افسانہ نگار کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ ان کی اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

''آنسو اور ستارے''، ''لہو اور قالین''، ''ستون''، ''فصیلِ شب''، ''خاک نشیں''، ''پسِ پردہ'' اور ''شیشے کی دیوار''۔ ان کے علاوہ ''صحرا نورد کے خطوط''، ''صحرا نورد کے رومان'' اور ''مٹی کا دیا'' (آپ بیتی) ان کی زندہ رہنے والی کتابیں ہیں۔

11

اولڈ ایج ہوم

تدریسی مقاصد

- طلبہ کو افسانے کے موضوع یعنی معاشرے میں بزرگوں کی بے قدری اور تنہائی سے روشناس کرانا
- سماجی رویّوں، اخلاقی قدروں اور خاندانی نظام کے زوال اور انہدام پر تنقیدی نظر ڈالنا
- افسانہ کے اسلوب، بیانیہ تکنیک اور علامتی معنویت کو سمجھنا
- طلبہ کو نثری صنف خاکہ نگاری، افسانہ نگاری اور ذو معنی، متشابہ الفاظ سے روشناس کرنا

آخری سیڑھی اور اُس کے کمرے کے درمیان کم وبیش دس گز کا فاصلہ حائل تھا اور یہ فاصلہ اُس کے لیے ایک بڑی آزمائش کا مرحلہ بن جاتا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند ہوتا تھا تو اُسے کسی قدر اطمینان ہو جاتا تھا کہ اُس کے پوتے اور پوتیوں کے حملے سے اس کا کمرہ محفوظ ہے مگر جب اس کے دونوں پٹ کھلے ہوتے تھے اور دروازے کے باہر کمرے کی کوئی نہ کوئی چیز پڑی ہوتی تھی تو اس کی پیشانی شِکن آلُود ہو جاتی تھی اور چہرے کی بوڑھی رگیں زیادہ نمایاں ہو کر اس کی کرب انگیز دلی کیفیت کا اظہار کرنے لگتی تھیں۔

اُس وقت کمرے کے دونوں پٹ کھلے تھے۔

''او میرے خدایا!'' اُس کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا اور کمرے کے اندر چلا گیا۔

جس غارت گری کا اُس نے اندازہ لگایا تھا وہ صورتِ حال سے کچھ کم تر ہی تھی۔ اُس روز محمود اور اس کی دونوں بہنوں نے معمول سے زیادہ ہی تباہی مچا دی تھی۔

پلنگ کی چادر، جسے اس کی بہو نے صرف ایک روز پہلے بدلا تھا، اس پر جا بجا مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ انھوں نے پلنگ پر بیٹھ کر کوئی میٹھی چیز کھائی کم اور گرائی زیادہ تھی اور ہر طرف بکھرے ہوئے ریزوں نے مکھیوں کو دعوتِ عام دے دی تھی۔

میز پر کتابیں وہ بڑی ترتیب کے ساتھ رکھا کرتا تھا۔ اُسے اپنی کتابوں سے بڑی محبت تھی اور انھی کا مطالعہ کر کے اپنا وقت بِتاتا تھا۔ یہ ساری کتابیں مُنتشَر حالت میں پڑی تھیں۔

قالین پر اُگال دان اُلٹا پڑا تھا۔ حُقّہ، کمرے کے ایک گوشے میں رکھا ہوتا تھا۔ وہ کمرے کے عین وسط میں اس عالمِ بیچارگی میں پڑا تھا کہ اُس کی چلم غائب تھی اور چلم کے کوئلے اِدھر اُدھر دکھائی دے رہے تھے۔

پنشن کے لیے گھر سے جانے سے پہلے، وہ دھوبی کے دُھلے ہوئے کپڑے لا کر کرسی کے اوپر رکھ گیا تھا کہ واپس آ کر انھیں الماری کے خانے میں رکھ دے گا۔ ان میں سے کوٹ نکل کر پلنگ پر پڑا تھا۔ محمود نے ضرور اسے پہن کر دادا جان بننے کی کوشش کی ہوگی۔

ایسے میں اس کا صبر وقرار جواب دے جاتا تھا اور وہ کھڑکی سے منہ باہر نکال کر اپنی بہو کو بڑے غصے سے مخاطب کرتا تھا اور اس روز بھی

اُس نے یہی کیا تھا۔

''زینب! تم اپنے بچوں کو قابو میں نہیں رکھ سکتیں، اوپر آ کر دیکھو تو، کیا حالت کر دی ہے میرے کمرے کی!''

بچے اپنے دادا جان کو گھر کے اندر آتے دیکھ کر چُپکے سے کِھسک جاتے تھے، اس لیے زینب انھیں بے تحاشا بددُعائیں دینے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔

''میں کیا کروں بابا جی! آپ انھیں کیوں نہیں سمجھا لیتے؟''

اپنی بہو کا یہ رویّہ اس کے لیے حیران کن تھا۔ وہ تو سُسر کی غُصیلی آواز سنتے ہی دروازے کی طرف بھاگتی تھی اور محمود یا اس کی کوئی بہن ہاتھ آ جاتی تھی تو مار مار کر اس کا کچومر نکال دیتی تھی مگر اُس روز اُس نے ایک فقرہ کہہ کر ہی اپنی طرف سے معاملہ ختم کر دیا تھا۔

ماں بچوں کو بددعائیں دیتی تھی تو اُس کا غصہ بھی ذرا دب جاتا تھا لیکن اس روز اس نے جس ردِعمل کا اظہار کیا تھا، وہ اُسے بڑا غیر مناسب لگا۔ وہ کھڑکی سے پرے ہٹ گیا۔ اُس کی پیشانی زیادہ شکن آلود ہو گئی تھی اور سانس شدید غُصے کی حالت میں تیزی سے آنے جانے لگا تھا۔

''کیا اس نے بچوں کو شہ دی ہے؟'' اُس نے خود سے سوال کیا اور وہ نیچے آ گیا۔

زینب، نلکے کے نیچے کپڑے دھو رہی تھی۔ ''زینب! تم نے ان بدتمیزوں کو اتنی کُھلی چُھٹی کیوں دے رکھی ہے؟ انھیں کمرے میں جانے ہی کیوں دیتی ہو؟ تمھیں خبر نہیں کہ میرے کمرے کے اندر جا کر وہ کیا کرتے ہیں؟''

زینب نے ہاتھ میں ڈنڈا اٹھا رکھا تھا جسے وہ کپڑوں پر مار رہی تھی۔ اپنے سُسر کے الفاظ سُن کر اس نے بے دھیانی میں ڈنڈا، نلکے پر زور سے مار دیا اور چمک کر بولی: ''یہ میری کم بخت اولاد ہے تو آپ کی کچھ نہیں لگتی ہے؟''

زینب اس کے سوال کا کیا جواب دے رہی تھی۔ اُس کے الفاظ نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔

''میری کچھ لگتی ہے یا نہیں لگتی مگر۔''

زینب تڑپ اٹھی۔ فوراً بولی۔۔۔ ''کچھ نہیں لگتی ناں؟''

''زینب! میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میری چیزوں کو اس طرح تباہ کیا جائے۔''

''تو مَیں کیا کر سکتی ہوں؟ پکڑ کر گلے گھونٹ دیں ان کے۔''

اُن کی بہو کو کیا ہو گیا ہے۔ تُرکی بہ تُرکی جواب دے رہی ہے۔ بیٹا بھی اپنے کمرے میں موجود ہے۔ اُسے ضرور صورتِ حال کا علم ہو چکا ہے مگر نہ تو باہر آیا ہے نہ بچوں کی معمول کے مطابق سرزنش کی ہے۔

''اچھا! کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ تم لوگ چاہتے ہو کہ میں گھر سے نکل جاؤں۔'' اور وہ تیزی کے ساتھ دروازے سے باہر آ گیا۔

میرزا عبدالقیوم نے ساری زندگی صوبائی حکومت کے ایک دفتر میں ملازمت کی تھی۔ وہ معمولی کلرک سے اعلیٰ افسر کے عہدے تک پہنچا تھا اور اس کی ترقی کا حقیقی سبب اس کی ایمان داری، دیانت داری اور منصبی فرائض سے گہری دل چسپی تھی۔

ملازمت کے اختتام پر، دفتر کے سربراہ نے بڑی کوشش کی تھی کہ اس کی دفتر سے وابستگی میں توسیع کروا دی جائے مگر وہ خود اس پر راضی نہ ہوا۔

اپنے دوستوں سے تو اس نے یہی کہا کہ میں نے اپنے حصے کا کام کر لیا ہے، اب یہ دوسروں کا حق ہے کہ وہ آگے بڑھ کر اپنی ذمے داریاں نبھائیں۔ میں کسی کا حق مارنا نہیں چاہتا۔ اس کے دوستوں نے قطعِ ملازمت کا یہ جواز تسلیم کر لیا تھا لیکن دل کی بات اس نے کسی سے بھی نہیں کہی تھی اور دل کی بات یہ تھی کہ وہ دفتری ہنگاموں سے دور ہو کر بڑے پُرسکون ماحول میں بقیہ زندگی بسر کرنے کا آرزومند تھا۔

''خاموشی، سکون اور اپنا دن اور اپنی رات۔'' یہ تھی اس کی آرزو جو چُھٹی کے وقت اپنے کاموں سے فراغت پانے کے بعد یا گھر میں اپنے مخصوص کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے اُس کے دل و دماغ میں چھا جاتی تھی اور وہ ان لمحوں کی گود میں چلا جاتا تھا جب دفتر سے رشتہ منقطع کرنے کے بعد خاموشی، سکون اور اپنے سارے معمولات میں مکمل آزادی حاصل کر لے گا۔ اس ماحول کا تصور کرتے وقت اُسے ایک عجیب سی خوشی مل جاتی تھی اور وہ دیر تک اس تصوّر میں ڈُوبا رہتا تھا۔

پہلے دن جب صبح اُٹھ کر اُس نے یہ خیال کیا کہ اب سارا دن اس کا اپنا ہے اور اُسے کہیں بھی آنا جانا نہیں ہے۔ کوئی بھی فریضہ ادا کرنا نہیں ہے تو اس کا دل سرخوشی کی ایک ایسی کیفیت محسوس کرنے لگا جِسے وہ اپنی تمام تگ و دو کا حاصل سمجھتا تھا۔

وہ خوش تھا، مطمئن تھا۔

اُس نے اپنے کمرے کو ٹھیک کرنے کا ارادہ کیا اور اپنی بہو سے جو بچوں کے ساتھ ناشتا لے کر آ گئی تھی، کہا:

''زینب! اب تو یہی میری دنیا ہے۔ یہ میرا کمرہ، اِسے ٹھیک ٹھاک کرنا ہوگا۔ تمھارا کیا خیال ہے؟''

''ضرور بابا جان! جو کچھ آپ چاہتے ہیں ہو جائے گا، حکم کیجیے۔'' اُس کی بہو نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ صوفہ سیٹ پرانا ہو گیا ہے۔''

''نیا خرید لیں گے۔''

''میز بھی نئی۔''

''بس ٹھیک ہے۔''

اُس کی بہو مسکرا رہی تھی۔

''بابا جان! میں آج ہی پرانی چیزیں نکلوا لوں گی۔ صوفہ سیٹ خرید لائیں گے اور بھی سب کچھ۔۔۔ محمود کے ابو بھی کہہ رہے تھے کہ ابا جان اب گھر پر ہی رہا کریں گے۔ انھیں ہر طرح آرام پہنچائیں گے۔''

چند روز میں کمرہ ٹھیک ہو گیا، اسے ٹھیک کرنے میں اُس نے خود کم اور گھر والوں نے زیادہ حصہ لیا تھا۔

ایک ہفتہ اس انداز میں گزرا جس انداز میں وہ گزارنا چاہتا تھا۔ دفتر کے پرانے ساتھی اس سے ملاقات کے لیے آتے رہے۔ اُس کا پوتا اور دونوں پوتیاں چائے اور کھانا اس کے کمرے ہی میں پہنچاتے رہے۔ اس قسم کا ہنگامہ ضرور رہا لیکن اُسے یقین تھا کہ یہ سب کچھ عارضی ہے۔ احباب آتے ہیں تو آیندہ آنے سے رُک جائیں گے۔ اس کی بہو بچوں کو ڈانٹنے ڈپٹنے میں جو شور کرتی ہے، یہ بھی اُس وقت ختم ہو جائے گا یا بہت حد تک تھم جائے گا، جب وہ ان کی ماں کو سمجھا دے گا کہ بچوں کے ساتھ مادرانہ شفقت کا رویّہ اختیار کرے۔ بچے اوپر آتے ہیں، اپنے

جوتوں کے ساتھ اندر آ کر قالین خراب کر دیتے ہیں، تو یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے، وہ انھیں بتا دے گا کہ اُوپر میرے کمرے میں آؤ تو جوتے اتار کر آؤ۔

تین ہفتے بیت گئے اور پھر اُس کے ذہن میں اندیشہ ہائے دور دراز اپنا سایہ ڈالنے لگے۔ اُس نے سوچا تھا کہ دفتر کے کچھ لوگ آتے ہیں تو اظہارِ محبت کے لیے آتے ہیں۔ آخر کب تک یہ اظہار ہوتا رہے گا، مگر اتنی مدت صبر سے کام لینے کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ یہ سلسلہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔

پہلے اُس کے پرانے اور نئے ساتھی محض اسے، اُس کے شان دار کیرئیر (career) پر مبارک باد دینے کے لیے آتے تھے۔ اب وہ اُس سے ہدایات لینے کے لیے آنے لگے تھے۔

”سر! ایسے کاغذات کن فائلوں میں رکھے جاتے ہیں؟ بڑے افسر کے ہاں جا کر سوال کس طرح کرنا چاہیے؟“

یہ لوگ عام طور پر یہی سوال کرتے تھے اور وہ جواب دے دے کر بور ہو جاتا تھا۔ اس سے بڑی کوفت اُسے اپنے پوتے اور پوتیوں سے ہونے لگی تھی۔ وہ سیر و تفریح کی خاطر، کسی سے ملاقات کے لیے، کوئی چیز خریدنے کے لیے گھر سے باہر نکلتا تھا تو بچے سکول سے واپس آ کر گھر میں ہوتے تھے تو بے تکلف اُس کے کمرے میں آ جاتے تھے اور طوفانِ بدتمیزی مچا دیتے تھے۔ چیزوں کی بے ترتیبی دیکھ کر اُسے دکھ ہونے لگا تھا۔

اپنے کمرے کی تباہی پر اسے ہر بار ذہنی کوفت ہوتی تھی مگر جب اس کی بہو بچوں کو بُری طرح ڈانٹ ڈپٹ دیتی تھی بلکہ کسی نہ کسی کی پٹائی بھی کر دیتی تھی اور اُس کا بیٹا بھی اگر گھر میں ہوتا تھا تو اس ڈانٹ ڈپٹ میں حصہ لینے سے باز نہیں رہتا تھا تو اس کا غصہ کسی قدر ہلکا ہو جاتا تھا اور وہ آہستہ آہستہ نارمل حالت میں آ جاتا تھا، مگر اُس روز تو ان دونوں نے ایک ایسا رویّہ اختیار کر لیا تھا جو اُس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

بہو کا فقرہ، ”تو میں کیا کر سکتی ہوں، پکڑ کر گلے گھونٹ دیں ان کے۔“ اس کے ذہن پر مسلسل ضربیں لگا رہا تھا۔

وہ بغیر کسی مقصد کے گلیوں اور بازاروں کے چکر لگاتا رہا۔ باغوں میں گھوما، کتابوں کی دکان پر کچھ کتابیں خریدیں اور ایک اخبار بھی۔

گھر پہنچ کر وہ کسی سے کچھ کہے سُنے بغیر اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا اور بستر پر گر کر ایک نئی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔

شام ہو چکی تھی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ کتاب پڑھنا ممکن نہیں تھا اور اس کے اعصاب پر کچھ ایسا بوجھ پڑ چکا تھا کہ بستر سے اُٹھ کر بجلی کے سوئچ بورڈ تک جانا دُوبھر لگ رہا تھا۔

وہ کتاب بند کر کے لیٹ گیا۔

بہو اور بیٹے کی بے نیازی اُسے یاد آ گئی اور اپنے وہ الفاظ بھی جو اُس نے گھر سے نکلتے وقت اپنی بہو سے کہے تھے ”اب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ تم لوگ چاہتے ہو کہ میں گھر سے نکل جاؤں۔“

”مگر میں کیا کر سکتا ہوں؟ کہاں سر چھپاؤں جا کر؟ کدھر جا سکتا ہوں؟“

یہ سوچ کر اس پر ایک گہری افسردگی طاری ہو گئی۔

اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اچانک اُس کی بند آنکھوں پر کسی نرم سی شے نے مَس کیا۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس کی بڑی پوتی کلثوم پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''دادا ابو! سو گئے تھے آپ؟''

''کیوں آئی ہو یہاں؟'' وہ گرجا۔

بچی کی آنکھوں میں جو میٹھی سی معصومانہ مسکراہٹ جھلک رہی تھی، فی الفور غائب ہو گئی۔

''دادا ابو!''

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

''کیا ہے؟''

وہ دوبارہ گرجا۔

''وہ۔۔۔ دادا ابو! کھانا۔۔۔''

''نہیں! بھوک نہیں ہے مجھے۔ بھاگ جاؤ فوراً۔''

کلثوم کمرے سے باہر جانے لگی۔

جب وہ کمرے میں آیا تھا تو اُس نے اِدھر اُدھر نظر نہیں ڈالی تھی۔ آتے ہی بستر پر آ پڑا تھا۔ اب اس نے دیکھا کہ کمرے کی صفائی ہو گئی ہے مگر کتابیں بدستور منتشر ہیں۔

''جاہل عورت!''

وہ اپنی ان پڑھ بہو کو جاہل سمجھتا تھا۔ اُس کے بیٹے نے محبت کی شادی کی تھی اور وہ شروع ہی سے بہو کو پسند نہیں کرتا تھا، اگرچہ وہ اُس کے آرام کا ہر طرح خیال رکھتی تھی۔

چند منٹ بعد بہو اور بیٹا آ گئے۔

''بابا جان! کھانا کھا لیجیے ناں۔'' یہ اُس کی بہو کے الفاظ تھے۔

''نہیں! کہہ جو دیا، بھوک نہیں ہے۔ کیوں پریشان کرتے ہو مجھے؟''

''مگر ابو! آپ نے تو دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔'' اس کا بیٹا بولا۔

باپ نے خشمگیں نظروں سے بیٹے کو دیکھا اور بیٹے نے نظریں جھکا لیں۔ کچھ اور اصرار کرنے کے بعد دونوں مایوس ہو کر چلے گئے۔

اُن کے جانے کے بعد اُس نے پھر کتاب اٹھائی لیکن آدھ صفحہ پڑھ کر ہی اُسے چھوڑ دیا۔ سرہانے کے اوپر اخبار بھی کُھلا ہوا پڑا تھا۔ کتاب ایک طرف رکھ کر اُس نے اخبار اٹھا لیا۔ وہی دہشت ناک خبریں تھیں جو اخباروں میں نمایاں طور پر چھپتی ہیں۔ یکا یک اُس کی نگاہ ایک اشتہار پر پہنچ کر رک گئی۔

اس اشتہار میں امریکی طرز پر ایک اولڈ ایج ہوم (Old Age Home) کے قیام کی خوش خبری سنائی گئی تھی اور اُن بوڑھے مردوں اور بوڑھی عورتوں کو اس ہوم کے مالک احمد جاوید سے ملنے کو کہا گیا تھا جو بڑھاپے میں پُرسکون زندگی بسر کرنے کے آرزومند ہیں۔ نیچے احمد جاوید کا پتا درج تھا۔

اُس نے سانس روک کر یہ خبر پڑھی۔

یہ تو بہت ہی اچھی خبر ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا اور اخبار کو لپیٹ کر تپائی کے اوپر رکھنے سے پیش تر وہ تین بار اس اشتہار کو پڑھ چکا تھا۔

صبح اُس کی بہو ناشتا لے کر آ گئی۔

’’بابا جی! خدا کے لیے انکار نہ کریں۔‘‘

بہو نے یہ الفاظ بڑی لجاجت سے کہے تھے، اُس نے بہو کے ہاتھ سے ٹرے لے لی اور وہ اپنے سُسر کو بڑی ممنونیت سے دیکھنے لگی۔

جلدی جلدی ناشتا کرنے کے بعد اس نے لباس تبدیل کیا اور احمد جاوید سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گیا۔

احمد جاوید کی عمر پچاس پچپن سے کم نہیں تھی مگر بڑا چاق چوبند دکھائی دیتا تھا۔ لباس فیشن کے مطابق، چوڑی پیشانی اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ بڑی خوشی سے اُس نے خیر مقدم کرتے ہوئے اُسے اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ نام وغیرہ پوچھا۔ حالات دریافت کیے اور جب اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ جس شخص سے وہ ملاقات کر رہا ہے وہ ہوم میں داخل ہونے کے لیے بے قرار ہے تو بولا:

’’مجھے، آپ کی تشریف آوری پر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ آپ کی خواہش کی تکمیل کر کے مجھے اور خوشی ہو گی۔ میں نے اپنی زندگی کا ایک اچھا خاصا حصہ امریکا میں گزارا ہے۔ اس کی کچھ چیزیں مجھے پسند نہیں آئیں۔ کچھ پسند آئی ہیں اور ایک چیز جو بہت زیادہ پسند آئی ہے وہ اولڈ ایج ہوم کا سسٹم ہے۔ میں کئی بار اس قسم کے ایک ہوم میں گیا تھا اور وہاں رہنے والوں کو بہت مسرور اور مطمئن پایا تھا۔ سچ کہتا ہوں اُن کے چہروں پر مجھے جو سکون نظر آیا تھا وہ قابلِ رشک تھا۔‘‘

احمد جاوید نے ذرا رک کر اپنے ملاقاتی کا غور سے چہرہ دیکھ کر، اُس کے ردِّعمل کو بھانپنے کی کوشش کی۔ یہ ردِّعمل اُس کی منشا کے عین مطابق تھا۔

’’میں نے قیامِ امریکا کے دوران ہی اپنے ہاں اولڈ ایج ہوم بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میرے محترم! آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں گے کہ سن رسیدہ افراد کو بڑے سکون کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ان بے چاروں کو نہیں ملتا۔ اِسی ضرورت کو مدِنظر رکھ کر میں نے زرِکثیر صَرف کر کے ایک بہت آرام دہ اور ہر لحاظ سے مکمل ہوم بنا لیا ہے۔ اخراجات کے لیے بڑی معمولی رقم مقرر کی ہے۔‘‘

’’کتنی؟‘‘ اُس نے پوچھا۔

’’صرف ایک ہزار ماہانہ، جو ہوم کی سہولتوں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔‘‘

’’ٹھیک۔ اور کچھ؟‘‘

’’اور کچھ؟ بس آپ چلیے میرے ساتھ۔ میں آپ کو ہوم دکھا دوں۔‘‘

چائے پینے کے دس منٹ بعد وہ احمد جاوید کے ساتھ ایک خوب صورت، سجے سجائے کمرے میں کھڑا تھا۔ اس کمرے میں، سب کچھ موجود تھا۔ صوفہ سیٹ، کرسیاں، میز، تپائیاں، بک شیلف، الماریاں۔ فرش پر قالین، دیواروں پر رنگارنگ تصویریں۔ ایک طرف وال کلاک۔

احمد جاوید نے مزید سہولتوں کی تشریح کی۔

”ایک ملازم اور ایک ملازمہ خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ گھنٹی بجایئے، ایک منٹ میں موجود۔ ناشتا، کھانا وقت پر اور کیا چاہیے پُرسکون زندگی کے لیے؟“

اُسے کمرہ بہت پسند آیا۔

”اور کمرے بھی ہوں گے اور ان میں؟“

احمد جاوید بات سمجھ گیا۔

”اور کمرے ضرور ہیں مگر جیسا کہ میں بتا چکا ہوں ابھی اس سسٹم کی ابتدا ہوئی ہے۔ لوگ آتے جائیں گے اور ایک دن یہ ہوم واقعی اولڈ ایج ہوم بن جائے گا۔“

”تو ابھی صرف میں؟“

احمد جاوید نے جواب دیا۔

”آپ کی طرح ایک صاحب آئے تھے۔ بے حد مطمئن اور خوش تھے۔ افسوس انھیں ایک پرانی بیماری نے کچھ زیادہ مدت خوشی سے زندگی بسر کرنے نہ دی۔ فوت ہو گئے۔“

اُس دن دوسرے پہر وہ اپنی کتابیں اور کپڑے لے کر، گھر والوں کو حیران و پریشان چھوڑ کر احمد جاوید کے اولڈ ایج ہوم میں آ گیا۔ شام تک سارا وقت بک شیلف میں کتابیں ترتیب کے ساتھ رکھنے، کمرے کے فرنیچر کا اچھی طرح جائزہ لینے، نوکر اور نوکرانی سے تعارف ہونے میں گزر گیا۔ نوکر کا نام بخشو تھا اور نوکرانی رشتے میں اس کی خالہ تھی جس کا نام ہاجرہ تھا۔

ہاجرہ نے بڑے سلیقے سے چائے کی ٹرے اُس کے آگے تپائی پر رکھی تھی اور خود مؤدب ہو کر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔

”بس جاؤ!“

”جی کوئی حکم؟“

”نہیں، کوئی نہیں۔“

کتنی تربیت یافتہ نوکرانی ہے۔ اُسے اپنی بہو یاد آ گئی جو اس کے ایک مرتبہ کہنے پر اوّل تو چائے بھیجتی ہی نہیں تھی، دو تین بار کہتا تھا تو کوئی بچہ چائے لے کر آ جاتا تھا جو کافی ٹھنڈی ہوتی تھی۔ دو تین گھونٹ بھر کر وہ پیالی ہاتھ سے رکھ دیتا تھا اور جب سیر کے لیے باہر جاتا تھا تو کسی ریستوران میں بیٹھ کر خوش گوار ماحول میں چائے پی لیتا تھا۔

چائے پینے کے بعد اُس نے کھڑکی کا پٹ کھول کر فضا میں دیکھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اس روز فضا کچھ بدلی بدلی لگتی تھی۔ ہوا کے

ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکوں نے اُس کے ماتھے کو چھوا تو اسے ایک نئی لذت کا احساس ہوا۔

''خواہ مخواہ اتنا وقت اُس منحوس گھر میں بِتایا۔ کاش! اس ہوم کا علم ریٹائرمنٹ کے وقت ہی ہو جاتا۔'' اس نے سرد ہوا میں لمبا سانس لے کر سوچا۔

شام کو کمرے سے باہر نکلا اور سیر کو روانہ ہو گیا۔

گھنٹا بھر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد کمرے میں آ گیا۔ احمد جاوید کرسی میں بیٹھا اس کا منتظر تھا۔

''ویلکم سر!'' تعظیماً اُس نے اُٹھ کر کہا۔

''شکریہ۔''

''میں صرف یہ پوچھنے حاضر ہوا ہوں کہ کسی قسم کی دِقّت، کوئی تکلیف؟'' احمد جاوید نے کرسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جی بالکل نہیں! بہت خوش ہوں۔''

آپ یہاں ہمیشہ خوش ہی رہیں گے۔ جلد ہی ایک صاحب آ جائیں گے۔ تنہائی نہیں رہے گی۔

''کوئی صاحب آنے والے ہیں؟'' اس کا سوال تھا۔

جی ہاں۔ انھیں بھی بڑھاپے میں سکون کی تلاش ہے۔ جلد جلد اپنے معاملات نپٹا رہے ہیں۔ بڑے خوش مزاج آدمی ہیں۔ امریکا میں بھی کئی سال گزار چکے ہیں۔ یہ آپ کے ساتھی بنیں گے۔

''بہت خوب!''

اور احمد جاوید شب بخیر کہہ کر چلا گیا۔

رات کا کھانا آ گیا۔ سادہ کھانا تھا مگر مزے دار۔ کھانا کھا کر اس نے چائے منگوائی اور اس سے فارغ ہو کر، کچھ دیر ایک کتاب کا مطالعہ کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔

''یہی سکون ہے، جس کی مجھے تلاش تھی۔ خوش قسمت ہوں کہ میرا خواب پورا ہو گیا ہے۔''

وہ جب تک جاگتا رہا، ایسے ہی خوش آیند تصوّرات اس کے ذہن پر چھائے رہے، پھر وہ سو گیا۔

صبح اٹھا تو اس کا جی بے اختیار چاہا کہ کچھ گنگنائے:

خدا جانے یہ کس کو دیکھ کر، دیکھا ہے دنیا کو
کہ جو شے ہے، نگاہوں کو حسیں معلوم ہوتی ہے

دوسرا مصرع وہ بار بار گنگناتا رہا۔

ملحقہ غسل خانے میں وہ نہایا دھویا۔ نکلا تو چائے کی ٹرے تپائی پر رکھی ہوئی تھی۔

''یہ سہولت، اس منحوس گھر میں کہاں تھی؟''

چائے پی کر وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

فضا میں روشنیاں اترتی چلی جارہی تھیں۔ بازاروں اور سڑکوں پر زندگی جاگ اٹھی تھی۔ بچے دو دو تین تین کی ٹولیوں میں مدرسوں کو جا رہے تھے۔ اُسے اپنے پوتے اور پوتیوں کا خیال آگیا۔ ''بدتمیز کہیں کے!'' اور وہ کھڑکی سے الگ ہوگیا۔

سکون کے دن تھے، سکون کی راتیں تھیں اور وہ خود کو ایک ایسا پنچھی محسوس کرتا تھا جو پنجرے کی قید سے رہائی پا کر فضا کی وسعتوں میں پوری آزادی کے ساتھ اُڑ رہا ہو۔

ایک ہفتہ بیت گیا۔ ایک اور ہفتہ بیتا اور وہ شام کی چائے پی کر سیر کے لیے جانے ہی والا تھا کہ امّاں ہاجرہ نے اوپر آکر اُسے اطلاع دی کہ آپ کے گھر والے آئے ہیں۔

''کیا ہے؟ آگئے ہیں تو ہُوا کیا ہے؟ مجھے واپس لے جانے سے تو رہے۔ چلے جائیں گے تھوڑی دیر بیٹھ کر۔''

''بلالو۔''

اُس کا بیٹا، بہو اور پوتا اور پوتیاں آگئیں۔ بہو نے پھل کی ٹوکری اٹھا رکھی تھی۔

''سلام علیکم ابو! سلام علیکم بابا جی! دادا جان سلام علیکم!''

آوازیں بلند ہوئیں۔ اس نے سر کی جنبش سے جواب دیا اور ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میاں بیوی صوفے پر اور بچے نیچے بیٹھ گئے۔

''ابو! آپ یہاں خوش ہیں؟'' اُس کے بیٹے نے سوال کیا۔

''بہت خوش ہوں۔ بہت مطمئن ہوں۔''

''اچھا بڑی اچھی بات ہے۔ ہمیں دکھ ہے کہ آپ کو خوش اور مطمئن نہیں کر سکے تھے۔'' بیٹے کے لہجے میں دبا دبا دکھ تھا۔

''بابا جی! اسے کیا کہتے ہیں؟'' بہو نے پوچھا۔

''اولڈ ایج ہوم۔''

اوّل بہو کی زبان پر پہلا لفظ ہی نہ آسکا۔ ''یہ ہوتا کیا ہے بابا جی؟''

اس نے گلو خلاصی کے لیے دونوں ہاتھ لہرائے۔ ''تم نہیں سمجھ سکتیں۔''

بیٹے نے باپ کو پھل کی ٹوکری دی۔

''مجھے یہاں کسی شے کی کمی نہیں ہے۔ سب کچھ مل جاتا ہے۔ لے جاؤ بچوں کے لیے۔''

''نہیں ابّو! یہ آپ کے لیے لائے ہیں۔''

باپ نے بیٹے کی طرف ٹوکری بڑھا دی تھی۔

اس دوران بچوں نے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا۔ دادا، محمود کی طرف دیکھتا تھا تو وہ فوراً اپنا سر جھکا لیتا تھا۔ یہی حال اُس کی بہنوں کا بھی تھا۔

’’کتنی چالاکی سے تمیزداری کا ڈراما کر رہے ہیں!‘‘ یہ سوچ کر وہ خود ہی مسکرا پڑا۔

گھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کون کون اسے ملنے کے لیے گھر آیا اور اسے کیا بتایا گیا۔ ہمسایوں کے سامنے اس کے بارے میں کیسی کیسی غلط بیانی کی گئی۔ یہ سب کچھ اُسے بتایا گیا۔

’’خبردار! کسی کو بھی یہاں کا علم نہ ہو۔‘‘ اس نے تاکیداً کہا۔

’’جی ابو! ہم نے کسی کو نہیں بتایا۔ آپ نے جو کہ دیا تھا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘

وہ جانے لگے تو بیٹے نے ایک بڑا سا لفافہ باپ کے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ وہ خط تھے جو اس کے نام اس کی عدم موجودگی میں آئے تھے۔ اُن کے چلے جانے کے بعد اُس نے لفافے سے خط نکالے اور ایک ایک کو پڑھنے لگا۔

ایک خط کتابوں کی ایک دکان سے آیا تھا جس میں اسے ”NEW ARRIVALS“ کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی۔ دوسرا خط اس کے پرانے دفتر کی یونین کے سیکرٹری کی طرف سے تھا جس میں اس سے درخواست کی گئی تھی کہ اپنے پرانے ساتھی فیروز دین کی الوداعی پارٹی میں شامل ہو کر ممنون فرمائے۔ دو خطوں میں اُس کے دوستوں نے اپنے بیٹوں کی شادی پر اُسے مدعو کیا تھا۔ کتابوں کی دکان والا خط اُس نے تکیے کے نیچے رکھ لیا اور باقی پھاڑ کر ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیے۔

’’اب میرا ان لوگوں سے کیا تعلق واسطہ؟‘‘

ایک مہینا گزر گیا۔ نوکر اور نوکرانی نے اپنی ذمے داریوں میں کبھی کسی قسم کی بے قاعدگی نہیں کی تھی مگر اس روز صبح کی چائے چھے بجے کی بجائے ساڑھے سات بجے ملی۔

’’ماف کر دو بابا جی!‘‘ ہاجرہ نے خود ہی کہنا شروع کر دیا۔ ’’چائے دیر سے ملی۔ دیر سے جو آئی ہوں۔‘‘

’’اچھّا۔‘‘ اُس نے ہاجرہ کے الفاظ کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

’’وہ جی۔۔۔ بمار ہو گیا تھا۔‘‘

’’کون بیمار ہو گیا تھا؟‘‘ اُس نے یوں ہی سوال کر دیا اور چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

’’جی وہ میرا پوتا جی۔ بڑا فکر ہے جی۔ بمار ہی چھوڑ کر آئی ہوں۔ میرا دھیان اُسی میں لگا ہوا ہے۔ دعا کریں، بزرگ ہیں۔ ٹھیک ہو جائے۔‘‘

وہ گھونٹ گھونٹ چائے پیتا رہا اور وہ ملتجیانہ نظروں سے اُسے دیکھتی رہی۔

’’دعا کریں گے ناں!‘‘

اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

’’ناشتا تھوڑی دیر بعد یا ابھی؟‘‘ ہاجرہ نے ٹرے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

’’تھوڑی دیر بعد۔‘‘

اور یہ الفاظ سن کر وہ چلی گئی۔

وہ جب کھڑکی کی طرف جا رہا تھا تو اُسے اپنے پوتے کا خیال آ گیا اور اس کے ساتھ ہی پوتے اور پوتیوں کے چہرے اس کے سامنے آ گئے۔ ”اُس روز کتنے مؤدب ہو کر یہاں بیٹھے تھے!“ وہ مسکرانے لگا۔

دھوپ پھیل چکی تھی۔ بازاروں میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ اُس کی نگاہیں دور سکول کی عمارت پر پڑیں۔ بچے قطاروں میں کھڑے تھے۔ دعا کر رہے ہوں گے۔ وہی دُعا جو اُس کا پوتا اور پوتیاں گھر آ کر کبھی کبھی اُسے سنایا کرتی تھیں۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

وہ کھڑکی میں کھڑا رہا۔ قریب کمرے کے اندر شور ہوا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ بخشو تھا جو ناشتا لے کر آیا تھا۔ بیڈ ٹی (Bed Tea) اور ناشتا ہاجرہ ہی لایا کرتی تھی۔ ناشتے کے بعد بخشو حقّہ تازہ کر کے لاتا تھا۔ ناشتا لانا اُس کی ڈیوٹی میں شامل نہیں تھا۔

”ہاجرہ کہاں ہے؟“ اُس نے کھڑکی سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”اسے اپنے پوتے کا بڑا فکر ہے۔ گھر چلی گئی ہے۔“

”زیادہ بیمار ہو گیا ہے؟“

”کہتی تھی بڑا کمزور ہو گیا ہے۔“

وہ کرسی میں بیٹھ کر ناشتا کرنے لگا۔ چند منٹ گزرنے پر بخشو حقّہ لے آیا۔

”تازہ اخبار لے آؤں بازار سے؟“

”نہیں، میں خود لے آؤں گا۔“

ناشتا کرنے کے بعد وہ بڑے اطمینان کے ساتھ حقّے کے کش لگاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ کش لگا رہا تھا اور جلد باہر نکلنا چاہتا تھا۔

اخبار خرید کر وہ اپنی منزل متعیّن کیے بغیر چلتا گیا۔ اخبار کی بڑی خبریں وہ کسی باغ میں بیٹھ کر پڑھتا تھا۔ اُس روز بھی ایک باغ کے اندر **بینچ** پر بیٹھ گیا۔

ایک دم شور بپا ہونے لگا۔ اُس نے سامنے دیکھا۔ لڑکے آدھی چُھٹی کے وقت خوش خوش شور مچاتے ہوئے اپنی اپنی کلاسوں سے نکل رہے تھے۔ اُسے سکول کی عمارت شناسا محسوس ہوئی اور دوسرے ہی لمحے اُسے معلوم ہو گیا کہ وہ اس سکول کے پاس بیٹھا ہے جس میں اُس کا **پوتا اور پوتیاں** پڑھتی ہیں۔

”پتا نہیں میں یہاں کیسے آ گیا؟“

وہ اخبار سرسری طور پر دیکھنے لگا۔ چند منٹ میں سارا اخبار دیکھ لیا۔ اُٹھا تو اُس کے پاس وہ تینوں کھڑے تھے۔

”تم؟“

تینوں نے بہ یک وقت اثبات میں سر ہلا دیے۔

’’ٹھیک ہو؟‘‘

پھر اسی طرح سر ہلنے لگے۔

’’دادا ابو جی۔ ہم۔۔۔‘‘

’’کبھی۔۔۔ دادا ابو جی۔۔۔۔۔۔‘‘ کلثوم بس اتنا کہہ سکی۔

نرگس نے کچھ نہ کہا صرف اپنا سر ہلاتی رہی۔

’’کیا یہ وہی بچے ہیں جنھوں نے اسے اس قدر پریشان کر دیا تھا۔ اب کہنا کیا چاہتے ہیں؟‘‘ آخر چھٹی کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ سکول کی گھنٹی اس کا اعلان کر رہی تھی۔

’’جاؤ اپنی کلاسوں میں!‘‘

اور وہ باغ سے باہر نکلنے لگا۔ باہر نکل کر وہ بغیر ارادے کے رُک گیا اور مُڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ تینوں ابھی تک وہیں کھڑے تھے اور اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ واپس پہنچا۔ بخشو کمرے کی صفائی کر چکا تھا۔

’’جناب! یہ آپ کا ہے؟‘‘ بخشو کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ ’’صفائی کرتے ہوئے، وہاں سے ملا ہے۔‘‘ بخشو نے کمرے کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

’’نہیں۔ میرا تو نہیں۔۔۔ دکھاؤ۔‘‘

اُس نے لفافہ لے لیا۔

’’شاید یہ اُن صاحب کا ہے جو، پہلے یہاں رہتے تھے۔‘‘

’’وہ بابا جی۔۔۔ بے چارے یہیں مر گئے تھے۔۔۔‘‘ بخشو نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ ’’کھانا کتنے بجے جی؟ ہاجرہ نہیں ہے ناں۔‘‘

’’میں بھی پکا لیتا ہوں جی!‘‘

’’جب پکا چکو تو لے آنا۔‘‘

بخشو چلا گیا۔

وہ کرسی میں بیٹھ گیا تھا۔ لفافہ ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھا۔ لفافے پر پتا درج تھا۔

برخوردار الطاف احمد،

مکان نمبر ۱۳۱۔ ڈی۔ محلہ ست رنگاں، اندرون موچی گیٹ، لاہور

’’یہ الطاف احمد کون تھا؟ برخوردار کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط لکھنے والے کا کوئی چھوٹا عزیز ہوگا۔ ممکن ہے بیٹا ہو۔ تو اس نے بیٹے کو کیا لکھا تھا اور یہ خط پوسٹ کیوں نہیں ہوا تھا؟ یہیں کیوں پڑا رہا؟‘‘

ایسے سوالات نے اُس کے ذہن کا احاطہ کرلیا تھا۔

’’اب وہ تو ہے نہیں جس نے خط لکھا تھا۔ دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔‘‘ اس نے لفافہ کھولنے کے لیے جواز تلاش کرلیا۔ ذرا سی ہچکچاہٹ۔۔۔ اور پھر لفافہ چاک ہو چکا تھا۔ وہ پڑھنے لگا۔ الفاظ ٹیڑھے میڑھے تھے۔ لگتا تھا لکھنے والے کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔

’’میرے عزیز بیٹے!

تم پر اللہ کی سلامتی ہو!

چار دن سے میری حالت کافی خراب ہوگئی ہے۔ ہارٹ بار بار تنگ کرتا ہے۔ زندگی سے اب مایوسی ہی مایوسی ہے۔

میرے عزیز اور پیارے بیٹے! تمھاری ماں کے انتقال کے بعد میں بُری طرح یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ بالکل بے آسرا اور بے سہارا ہو گیا ہوں۔ مجھے تم سے، تمھاری آپا سے یہ شکایت ہوگئی تھی کہ تم لوگ میری پروا نہیں کرتے۔ تم لوگوں کا سارا وقت اپنے بچوں، دوستوں اور سہیلیوں کے لیے وقف ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا ردِعمل یہ ہوا تھا کہ میں اپنے گھر سے بے زار ہو گیا تھا۔ چاہتا تھا کہ یہاں سے نکل بھاگوں۔ انھی دنوں احمد جاوید سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے بتلایا کہ امریکا میں اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں اولڈ ایج ہوم، بوڑھوں کے لیے ایک جنّت ہوتی ہے، جس میں رہنے والے بڑی پُرسکون زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس نے اسی طرز کا ہوم بنالیا تھا اور میں اس کی باتوں سے متاثر ہو کر اُس کے ہوم میں آ گیا تھا۔

یہ چند ہفتے جو میں نے یہاں گزارے ہیں میرے لیے عارضی سکون لے کر آئے تھے۔ بیٹا! جب سے بیمار ہوا ہوں، تم سب لوگ مجھے بہت یاد آ رہے ہو۔ اپنے کُنبے کی جُدائی مجھ پر شاق گزرنے لگی ہے۔

الطاف بیٹے! اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں نے ایک بہت بڑی غلطی کی تھی۔ یورپ میں گھر کا کیا تصوّر ہے میں نہیں جانتا، مگر ہمارا گھر تو ہماری چھوٹی سی ایک دنیا ہوتی ہے جس میں رہنے والے ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوتے ہیں کہ انھیں الگ الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ایک درخت کی طرح جس کی شاخیں زمین کے اندر ایک دوسری سے گُتھّی ہوتی ہیں۔ ہمارے گھر، بزرگوں کی شفقتوں، جوانوں کے قہقہوں اور بچوں کی معصوم مسکراہٹوں سے آباد رہتے ہیں۔ یہی سب کچھ ہماری زندگی کی رونق ہے۔ ہماری زندگی کی بہار ہے۔ اسی میں زندگی کا سارا حُسن ہے۔

یہاں تنہائی مجھے اندر ہی اندر چاٹتی رہی ہے۔ مجھے اب اس کا علم ہوا ہے۔ میرے پیارے بیٹے! آؤ اپنے بیمار اور لاچار باپ کو اُس گھر میں لے جاؤ جس میں اس کا حقیقی سکون ہے۔ آؤ الطاف! جلدی آؤ۔۔۔ میں تمھارا انتظار کررہا ہوں۔‘‘

یہ تحریر پڑھ کر اس کے اندر ایک ہیجان پیدا ہوگیا۔ وہ کرسی سے اٹھ بیٹھا اور ٹہلنے لگا۔ وہ کئی منٹ تک ٹہلتا رہا۔

بخشو آیا۔ ’’جناب! کھانا لے آؤں؟‘‘

’’مجھے یہ بتاؤ یہ خط یہیں کیوں پڑا رہا؟‘‘

بخشو سوچ کر بولا، ”جناب! میں نہیں جانتا۔ اُس نے ہاجرہ کو دیا ہوگا۔ وہ بھول گئی ہوگی۔“

”اس کے گھر سے کوئی آیا تھا؟“

”مرنے کے بعد اس کا بیٹا آیا تھا اور میّت لے گیا تھا۔“

وہ پھر کمرے میں پھرنے لگا۔

”کھانا لے آؤں جناب؟“ بخشو نے پوچھا۔

اُس نے ملازم کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنی کتابیں اور کپڑے ایک طرف رکھنے لگا۔ بخشو اُسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

(گلی گلی کہانیاں)

مشق

1 سبق ”اولڈ ایج ہوم“ کے متن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات تحریر کریں:

i ”اولڈ ایج ہوم“ سے کیا مراد ہے؟

ii افسانے کے مرکزی کردار کا کیا نام ہے اور وہ کس عہدے سے سبک دوش ہوئے؟

iii ”اولڈ ایج ہوم“ قائم کرنے والے کردار کا نام کیا ہے؟

iv ”یہ میری کم بخت اولاد ہے تو آپ کی کچھ نہیں لگتی؟“ یہ الفاظ کس نے کس سے کہے؟

v ”اولڈ ایج ہوم“ میں کام کرنے والے بخشو اور ہاجرہ کا آپس میں کیا رشتہ تھا؟

vi میرزا عبد القیوم نے اپنا پہلا دن ”اولڈ ایج ہوم“ میں کیسے گزارا؟

vii ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد میرزا عبد القیوم نے کس شوق میں وقت گزارنے کی منصوبہ بندی کی تھی؟

2 درست جوابات کی نشان دہی کریں:

i میرزا عبد القیوم کی بہو کا نام تھا:

(الف) کلثوم (ب) زینب (ج) خالدہ (د) نکہت

ii پوتے کا نام تھا:

(الف) احمد (ب) نوید (ج) کلیم (د) محمود

iii میرزا عبدالقیوم نے ساری زندگی ملازمت کی تھی:

(الف) کارپوریشن کے دفتر میں
(ب) صوبائی حکومت کے دفتر میں
(ج) بورڈ کے دفتر میں
(د) کالج میں

iv میرزا عبدالقیوم نے ''اولڈ ایج ہوم'' کے قیام کا اشتہار پڑھا:

(الف) ایک بار
(ب) دو بار
(ج) تین بار
(د) چار بار

v ''اولڈ ایج ہوم'' کے قیام کی بنیاد رکھی گئی تھی:

(الف) برطانوی طرز پر
(ب) ہسپانوی طرز پر
(ج) یونانی طرز پر
(د) امریکی طرز پر

3 افسانہ ''اولڈ ایج ہوم'' کے اہم نکات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے الفاظ میں خلاصہ تحریر کریں۔

4 میرزا ادیب کے افسانے ''اولڈ ایج ہوم'' اور امتیاز علی تاج کے تحریر کردہ ڈرامے ''آرام وسکون'' میں کس حد تک مماثلت موجود ہے؟

5 اولڈ ایج ہوم کے مالک ''احمد جاوید'' کی شخصیت اور خیالات کا جائزہ لیں۔ اس نے میرزا عبدالقیوم کو کس طرح ہوم میں ٹھہرنے پر آمادہ کیا؟

6 میرزا ادیب نے ''اولڈ ایج ہوم'' میں وفات پانے والے بزرگ کے خط کے ذریعے سے کن خیالات کا اظہار کیا ہے؟ تفصیل سے لکھیں۔

7 بزرگوں کو اولڈ ایج ہوم بھیجنا یا اس طرح کے حالات پیدا کرنا کہ وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں، کیسا عمل ہے؟

8 مشرقی اور مغربی خاندانی نظام کی خصوصیات پر ایک مضمون قلم بند کریں۔

9 مندرجہ ذیل جملوں کی سیاق وسباق کے حوالے سے وضاحت کریں:

i ''محمود نے ضرور اسے پہن کر دادا جان بننے کی کوشش کی ہوگی۔''

ii ''زینب! اب تو یہی میری دنیا ہے۔ یہ میرا کمرہ، اسے ٹھیک ٹھاک کرنا ہوگا۔''

iii ''اس کا پوتا اور دونوں پوتیاں چائے اور کھانا اس کے کمرے ہی میں پہنچاتے رہے۔''

iv ''کتنی چالاکی سے تمیز داری کا ڈراما کر رہے ہیں۔''

v ''دوسرے ہی لمحے اسے معلوم ہو گیا کہ وہ اس سکول کے پاس بیٹھا ہے جس میں اس کا پوتا اور پوتیاں پڑھتی ہیں۔''

vi ''یورپ میں گھر کا کیا تصوّر ہے میں نہیں جانتا، مگر ہمارا گھر تو ہماری چھوٹی سی ایک دنیا ہوتی ہے۔''

10 درج ذیل الفاظ و تراکیب اور محاورات کو جملوں میں استعمال کریں:

کم و بیش	شکن آلود	کھوج لگانا	فرائضِ منصبی	مادرانہ شفقت
اندیشہ ہائے دور دراز	ورق گردانی کرنا	خشمگیں نظریں	گلوخلاصی کرنا	شاق گزرنا

خاکہ

خاکہ کے لفظی معنی ابتدائی نقشہ یا ڈھانچا کے ہیں۔ ادبی اصطلاح میں خاکہ ایک ایسی نثری صنف ہے جو مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ کسی شخصیت کا بھرپور تاثر ابھارتی ہے۔ یہ کسی شخصیت کی قلمی تصویر (Pen-Sketch) ہوتا ہے۔ عمدہ خاکے کی خوبی یہ ہے کہ جس شخصیت کا خاکہ لکھا جا رہا ہو، اس کی شخصیت کے تمام تر ظاہری و باطنی خد و خال قاری کے سامنے آ جائیں۔ خاکے کو بے جا طویل نہیں ہونا چاہیے۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری کے ضمن میں مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، چراغ حسن حسرت، شاہد احمد دہلوی، فرحت اللہ بیگ، سعادت حسن منٹو اور ممتاز مفتی وغیرہ کے نام بہت نمایاں ہیں۔

افسانہ

اُردو ادب میں افسانہ بھی مغربی ادب سے آیا ہے۔ افسانہ ایک ایسی مختصر کہانی کو کہتے ہیں، جس میں زندگی کے کسی ایک واقعے، کردار یا کیفیت کو پیش کیا جاتا ہے۔ افسانے میں بیان ہونے والی کہانی اتنی مختصر ہونی چاہیے کہ اسے ایک نشست میں بہ خوبی پڑھا جا سکے۔

افسانے کی بنیادی خصوصیات

- اختصار
- وحدتِ تاثّر
- جامعیت

افسانے کی اقسام

۱۔ مقصدی افسانہ

۲۔ واقعاتی افسانہ

۳۔ نفسیاتی افسانہ

۴۔ کرداری افسانہ

۵۔ معاشرتی افسانہ

۶۔ علامتی یا تجریدی افسانہ

11 افسانہ ''اولڈ ایج ہوم'' کے مرکزی کردار ''میرزا عبدالقیوم'' کا خاکہ لکھیں۔

ذو معنی الفاظ

کچھ الفاظ ذو معنی ہوتے ہیں یعنی ایسے الفاظ، جن کے دو مفہوم ہوں، مثلاً:

ذو معنی الفاظ	معانی		ذو معنی الفاظ	معانی	
بیت	ا۔ گھر	۲۔ شعر	ظرف	ا۔ برتن	۲۔ حوصلہ
اوقات	ا۔ وقت کی جمع	۲۔ حیثیت	جست	ا۔ ایک دھات کا نام	۲۔ چھلانگ

12 درج ذیل ذو معنی الفاظ کے معانی لکھیں:

آب ظرف روزگار ہار مشتری

متشابہ الفاظ ایسے الفاظ جن کی ظاہری شکل وصورت ملتی جلتی ہو مگر وہ املا، اعراب اور معانی میں مختلف ہوں، متشابہ الفاظ کہلاتے ہیں۔ جیسے:

- **ارض (عربی):** زمین، جیسے: کرۂ ارض، ارض وسما
  عرض (عربی): عرض کرنا یعنی کوئی درخواست یا گزارش پیش کرنا جیسے: اَدب سے عرض ہے۔
- **سَحر (عربی):** صبح کا وقت، جیسے: سحر کا وقت تھا، معصوم کلیاں مسکراتی تھیں۔
  سحر (عربی): جادو، جیسے مقرر کی باتوں نے حاضرین پر سحر طاری کر دیا۔

13 درج ذیل متشابہ الفاظ کے معانی لکھیں:

ظن، زن اصرار، اسرار سدا، صدا لال، لعل کثرت، کسرت

سرگرمیاں برائے طلبہ

- ○ معاشرے میں ''اولڈ ایج ہوم'' کے قیام کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟ اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر گفت گو کریں۔
- ○ ''اولڈ ایج ہوم'' کے مرکزی کردار کے جذبات واحساسات اور بدلتے ہوئے رویّوں پر ایک نوٹ لکھیں۔
- ○ افسانہ ''اولڈ ایج ہوم'' میں جن کرداروں کے درمیان مکالمے ہوئے ہیں، ان کو ڈرامائی انداز میں پیش کریں۔

اشاراتِ تدریس

- ○ طلبہ کو بتائیں کہ سبق کے ایک مکالمے میں ''سلام علیکم'' اور ''سلاماں لیکم'' کہا گیا ہے، جب کہ اس کا درست املا اور تلفظ ''السلام علیکم'' ہے۔ طلبہ سے لکھنے کی مشق کروائیں۔
- ○ افسانہ ''اولڈ ایج ہوم'' میں جو اشعار آئے ہیں، ان کے شعرا کے نام بتائیں اور مفہوم واضح کریں۔
- ○ طلبہ کو اولڈ ایج ہوم کی تصویر، ویڈیو یا انٹرویو دکھائیں۔
- ○ والدین اور بزرگوں کے حقوق پر اسلامی تعلیمات کا حوالہ دیں۔